

دیر سے تکلنے والوں

جادو پر شاہین

تجھر، بخش اور تکر جادید شاہیں کی شعری
مسافت کے بنیادی معاصر ہیں جو اس کی شاعری
کو اعلیٰ درجے پر فائز کر کے عالم کی روز اور یہ عطا
کرتے ہیں۔ وہ کائنات اور اس کے مظاہر کو
ایک پیچ کی آنکھ سے دیکھاتے اور کسی فلسفی کی
طرح سوال اٹھاتا ہے۔

یہ دن اور رات آپس میں بدلتے ہیں کیا راجھرے
گھی رُت نے بس اپنا انداز میں جگہ ہو گا

سفر جادید شاہیں کی شاعری کا دوسرا انہم
حوالہ ہے۔ وہ بہت اندیاد کیہے پکا ہے۔ اس نے
تجھر بے نے اس پر حیرت کے کلی ملئے دروازے
سمھولے ہیں اور اس کی شاعری میں جگہ جگہ خود کو
خوبصورت انداز میں ظاہر کرتا ہے۔

ملتی نہیں پل بھر کو بھی دم لینے کی فرصت
دم لینا اگر پاؤں رکابوں عی میں رہتا

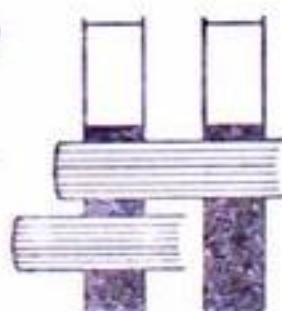
دیر سے نکلنے والا دن

(نیا ایڈیشن اضافے کے ساتھ)

جادو یہداشتا ہیں

فیکشن ہاؤس

18-مزگ روڈ لاہور



فون: 7249218-7237430

E-mail: FictionHouse2004@hotmail.com

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب : دیرے سے نکلنے والا دن

مصنف : جاوید شاہیں

پبلشرز : فلشن ہاؤس

18-مزگ روڈ، لاہور

فون: 7249218-7237430

اہتمام : ظہور احمد خاں

کمپوزنگ : فلشن کمپوزنگ اینڈ گرافیکس، لاہور

پرنٹر : حاجی حنیف پرنٹرز، لاہور

سرورق : عباس

اشاعت : 2004ء

قیمت : 120/- روپے

انتساب

فاروق عادل کے نام

کارخانہ شب کو محو ہوں چلانے میں
ساری رات لگتی ہے ایک دن بنانے میں

فہرست

نظمیں

15	بہت مصروف رہتا ہوں	❖
17	دیر سے کھلنے والا راز	❖
19	کوئی آواز ہے	❖
21	اک چھپی ہوئی سچائی	❖
23	ہادر تھے	❖
25	ہمیں کون بتائے	❖
27	شہر میں بہار کا موسم	❖
29	خبر ملتی ہے جب مجھ کو	❖
31	کہیں کوئی جگہ ہے	❖
33	یہی وہ گھڑی ہے	❖
35	میں نظم کیسے لکھتا ہوں	❖
37	وہ کیا شے ہے	❖

39	ایک عجیب پرندہ	❖
41	جب ملی تھوڑی فراغت	❖
43	جو موسم قید کرتا ہے	❖
45	یہ دن بھی	❖
47	مگر یہ سوچ کر.....	❖
49	کیا ہے فیصلہ میں نے	❖
51	بہت مدت گذرانے پر	❖
53	دن گذرتے جا رہے ہیں	❖
55 حبیب جالب سے	❖
57	۱۹۹۵ء کی آمد پر	❖
58	خود کلامی	❖
60	کرنے والے کچھ کام	❖
62	چہروں میں ایک چہرہ	❖
64	افتخار نیم کے لیے	❖
66	دری تک سونے والا	❖
	نئی نظمیں	
67	اک اور نام	❖
68	دن سے میرا وعدہ	❖

70	سوچتا ہوں	❖
72	نظم کہاں سے شروع کروں	❖
74	وہ عورت	❖
76	بھٹو کے لیے دو نظمیں	❖
79	ہم سے پوچھا جاتا ہے	❖

غزلیں

83	یہ جو خاک میں ہے ملا ہوا سر رہ گلاب گرا ہوا	❖
85	درد کسی کا لے کر اپنی ذات میں رکھنا ہے	❖
87	دنیا میں رہ کے ذات سے دنیا نکال دوں	❖
89	موج بلا بُھر گئی ایک عذاب رہ گیا	❖
91	کوئی رُت ادھر سے چلی گئی کسی دوسری کا قیام ہے	❖
93	یہ کیا کہ محبت کے عذابوں ہی میں رہنا	❖
96	کہوں کس سے کہ کیا باقی نہیں ہے	❖
98	کذا ک سفر تو نیا سفر وہیں اختتام پر رکھ دیا	❖
99	اُس نے دھکیلایا اس قدر دیوار کی طرف	❖
100	اچاٹ پھر ہوا دل گھر سے، گھر میں کیا پایا	❖
101	کہنے کو یوں بھلانہ کیا میرے ہنر کے پاس تھا	❖

103	اک پختہ داغ رات دن دھونے سے کم ہوا	❖
104	وہ جو ایک تار تھارات میں وہی جل گیا مرے سامنے	❖
105	یاؤں نے عمر بھر کیسے ملاں میں رکھا	❖
107	وہم سے دور اور گماں سے پرے	❖
109	پھر جانے کیا ہوا کہ کچھ سوچ کے در میں رک گئی	❖
111	میرے دل کا اک اک راز ہے یہاں دوسروں پر گھلا ہوا	❖
114	گھڑی یہ گھروں میں بھہرنے کی ہے	❖

نئی غزلیں

116	شور کرتی موج کو اُس کی روائی سے الگ	❖
118	کوئی پوچھ لے تو بتاؤں کیا مرے دل سے کیوں وہ اُتر گیا	❖
120	سکوتِ شب میں چلنے کا اشارہ رک گیا ہے	❖
122	کیا بند جلدی سے در شام کا	❖
124	نظر آتا نہیں کچھ ذات آگے	❖
126	کارخانہ، شب کو مجوہوں چلانے میں	❖
129	دے رہا ہے کام وہ ایسا میں کرنے سے رہا	❖
131	میں کہ تنہا اعتبارِ ذات کھونے سے ہوا	❖
133	شکوئے شکائیں ہی رازمانے کے ساتھ ساتھ	❖

- 135 یہ بے رحم رُت تو گذر جائے گی ♦
 137 یہی تو دکھ ہے کہ یہ آگھی کہاں تک ہے ♦
 139 تم لاکھ کہو کچھ بھی نہیں بات کوئی ہے ♦
 140 نظر آتا ہے اب حد سے گذرنا ہی پڑے گا ♦
 142 برا وقات کی ہر ایک صورت ساتھ رکھنی ہے ♦
 144 جو حرفِ مہرباں سے دل ہمارا رکھ لیا ہے ♦
 146 ضرورت ہے مری اک اور چہرہ ساتھ رکھتا ہوں ♦
 148 گھلا ہے پانیوں میں رنگِ یاس دریا کا ♦
 150 ہوا میں کچھ نہ کچھ تعمیر کرتا رہتا ہوں ♦
 152 بلا قی رہی دیر تک رہندر ♦
 154 میں جس شہر میں جس نگر میں رہا ♦
 156 خلوتوں سے نکلا ہے یہ جہان تھوڑا سا ♦
 158 غور سے کسی شے کو دیکھنا بھی ہوتا ہے ♦
 160 یقین اب کس تازہ گماں پر رکھنا ہے ♦
 162 اشجار، سائے، رانگذر سب ہیں خواب میں ♦
 164 کوئی دہم ہے یا گماں شام کا ♦
 166 دیوار چھوڑتی ہے تو در چھوڑتا نہیں ♦
 168 ہوئی پھر یہ تر فضا شام کی ♦

170

سب سے پہلے تو سوچنا ہے اُسے ♦

172

دامَ، ہی کسی شک کے گرفتاروں میں رہنا ♦

174

کوئی عکس میرے گمان کا یہیں ہے کہیں ♦

176

وہ حرکت سے عاری کڑی رات تھی ♦

نظمیں

بہت مصروف رہتا ہوں

بہت مصروف رہتا ہوں
 دلوں کے سرد موسم پر
 چمکتی دھوپ کا نکلا بچھانے میں
 محبت کے کسی ویرا ساحل پر
 پڑی ہے مونج چھوٹی سی
 اُسے دریا بنانے میں
 وہ اچھے دن
 ابھی جو خواہشوں کی منزلوں میں ہیں
 انہیں نزدیک لانے میں
 گذر اوقات کرتا ہوں

میں اپنی جس خرابے میں
 وہی اک شہر کی تعمیر میں
 مصروف رہتا ہوں
 سودا چشم میں
 نہ سہرا ہوا ہے خواب جو کب سے
 میں بس اُس خواب کی تعبیر میں
 مصروف رہتا ہوں

دیر سے کھلنے والا راز

کوئی خواب تھا

بڑا خوش قبا

جسے اوڑھ کر

میں پڑا رہا

وہ جو خواب تھا

اسی میں کہیں تھا

چھپا ہوا

کوئی جھوٹ بھی

اسی خواب کا

مری پشم بند پر راز یہ
 بڑی دیر بعد کہیں گھلا
 یہ جو عرصہ تھا مری عمر کا
 کسی جھوٹ ہی میں گذر گیا

کوئی آواز ہے

کوئی آواز ہے
 روٹھی ہوئی جیسے نگر سے ہے
 سفر میں ہے
 کہ اکتائی ہوئی اپنے سفر سے ہے
 پتا چلتا نہیں
 آتی کدھر سے ہے
 سواد شہر سے؟
 یا شہر کا پُر شور مرکز
 اس کا مسکن ہے؟
 کسی گنجان آبادی سے؟
 یا اس کا نہ کانہ کوئی بن یا کوئی مدفن ہے؟

جو دل میں جھانکتا ہوں
 تو اسے خاموش پاتا ہوں
 صمیر شہر بھی زر کے نشے سے
 بے طرح مدھوٹ پاتا ہوں
 بہت بھی غور کرنے سے
 گماں مجھ کو گذرتا ہے
 کہ یہ آواز دن کی ہے
 جو آہِ سرد بھرتا ہے
 اور اپنی روز کی لا حاصلی پر
 جین کرتا ہے

اک پُچھپی ہوئی سچائی

بہتے سے میں بعد اک مدت
 مجھ کو نظر وہ آئی
 ایسے تھی وہ جیسے،
 اپنے ماں کی پرچھائیں
 دیکھ کے اس کی حالت
 دل نے چوت عجائبی کھائی
 تھوڑی دیر الگ بیٹھے
 جو بیتی تھی دہرائی
 جانے لگی تو میں نے کہا
 اک بات نہیں بتائی

دل میں جو تھا کیوں اس کے
 انکار میں عمر گنوائی؟
 چند لمحے خاموش رہی
 جب اس نے آنکھ اٹھائی
 صافِ لکھی تھی چہرے پر
 اک پُھپھی ہوتی سچائی

ہاوتھے

دور تک، حد نظر تک
 صرف دیرانی ہی دیرانی
 پھر اس کے درمیاں
 ایک بستی
 رک گئے ہیں وقت کے پاؤں جہاں
 جس قدر گھر ہیں
 وہ سارے ہی قدیم
 سو برس کیا چیز ہیں
 دو سو برس سے بھی قدیم
 اک مسلسل نیندان پر حکمراں

بند ہیں سب کھڑکیاں
 کچھ سمجھ آتی نہیں
 ان کی بائی ہیں کہاں
 جم چکی ہے کافی ہر اک بام پر
 اُگ رہا ہے بنزہ ہر دیوار پر
 خامشی ہے اس قدر
 بولنے پر جسے قدغن ہو یہاں
 کون روکے گا مگر
 سرد میدانوں سے آنے والی
 بے پرواہواؤں کی زبان
 تنگ پتھر میلے گلی کوچے
 اور ان کے درمیاں
 تین بہنوں کا مکاں
 جس طرف ہیں
 شوق کے عالم میں اہل دل رواں

ہمیں کون بتائے

اب جب کہ موسمِ گرما
 بارشوں کی شدت سے ہلاک ہو چکا ہے
 اور بادلوں کے شکستہ جہاز
 آسمان کے نیل میں ڈوب چکے ہیں
 ہم اپنے دروازوں پر
 خزاں کی دستک سن رہے ہیں
 اور سوچ رہے ہیں
 کہ اس کا استقبال کن لفظوں میں کریں
 ہمارے لفظوں پر خاموشی جنم چکی ہے
 وہ یکسانیت کے مرض میں بتلا ہیں
 اور بے دریغ استعمال سے
 ناکارہ ہو چکے ہیں

ہم رنگ بدلتی دھوپ سے کیا کہیں
 بلکی خنک ہوا کاشکریہ کیسے ادا کریں
 گرمی سے جھلسی ہوئی زمین کا ذائقہ
 ابھی تک ہماری زبان جلا رہا ہے
 ہم کھڑکی پر پیشانی رکھے
 بے ارادہ باہر دیکھتے رہتے ہیں
 اور خالی دن کو
 نا آسودہ خواہشوں نے بھرتے رہتے ہیں

ہر روز

کسی نے غم کے مفتر رہتے ہیں
 ہمیں کون بتائے
 کہ ہم زندہ ہیں

شہر میں بہار کا موسم

موسم سرمائے جاتے جاتے
 اپنی آخری بارش سے
 بھر دی ہیں
 نشیبی بستیاں، ٹوٹی ہوئی سڑکیں
 فضا کے ایک تازہ نیلے پن کو
 کھا رہا ہے کارخانوں کا دھواں
 صاف اور اجلی ہوا کا
 گرد کی موئی سیہت سے گزرننا
 کس قدر دشوار ہے

رُت بدلنے کی خوشی میں
 طاڑوں کے چچھانے کی صدا
 کھوگئی ہے گاڑیوں کے شور میں
 اور پھولوں کی مہک
 ہر طرف پھیلی غلاظت کی فراوانی میں گم
 لوگ جس کے منتظر تھے وہ بہار
 شہر کے بے برگ پیڑوں کے تلے
 لیٹی ہوئی ہے بے لباس

خبر ملتی ہے جب مجھ کو

خبر ملتی ہے جب مجھ کو
 کسی نیکی کے مرنے کی
 کہیں انصاف لئنے کی
 محبت کے اجزے نے کی
 کسی چیز کو
 سراہ جھوٹ میں تبدیل کرنے کی
 کوئی سر بزر موسم راہ ہی میں سوکھ جانے کی

سفیدی صبح کی لے کر اسے گلنا کرتا ہوں
 پھر اس سے ان شہیدوں کے
 کفن تیار کرتا ہوں
 بظاہر ظلم سے
 اک جنگ کا اظہار کرتا ہوں
 مگر اندر سے
 مرد بیچنے کا روز کا رو بار کرتا ہوں

کہیں کوئی جگہ ہے

کہیں کوئی جگہ ہے

جو ہمیشہ خالی رہتی ہے

کبھی اک کھیت میں

کچھ تج مرنے سے

کبھی اک پیڑ پر

سوکھے ہوئے پتوں کے گرنے سے

تعلق کے کسی خاموشی ساحل پر
 کوئی پانی اترنے سے
 کسی بے نام رستے پر
 مسافر کے گذرے سے
 کبھی خود میرے اندر
 میرے اپنے ہی بکھرنے سے

یہی وہ گھڑی ہے

مری جاں! کہ جس میں
ضرورت تمہاری ہمیں آپڑی ہے
تمہاری طرف سے
کوئی حرفِ شفقت
کوئی حوصلہ
درد کا کوئی چارہ
ہمارے لیے بات سب سے بڑی ہے
بکھرنے کی یہ رُت
جو سر پر کھڑی ہے
گذر جائے گی جب
طبیعت ہر اک کی
نہ سمجھ جائے گی جب
کریں گے حسابِ دل و جان سارا

کہ ہے قرض کتنا کسی پہ تمہارا
 بکھرنے کی یہ رُت
 اگر اک بڑی ابتری کے نشاں دیکھ کر
 ڈک گئی اس زمیں پر
 تو پھر بھر تیں ہیں مقدہ رہمارا
 مری جاں !

فقط ایک تم ہو جسے ہے
 بکھرتی ہوئی چیز کو جمع کرنے
 اسے اک نئی شکل دینے کا یارا
 اگر قرض کوئی پرانا تمہارا
 ابھی تک گیا ہونہ ہم سے اتارا
 اسے یاد رکھنا

کہ آنا ہے ہم نے یہیں پہ دوبارہ
 تمہاری طرف سے
 کسی بزرگت کا
 ملا جب ہمیں کوئی روشن اشارا

میں نظم کیسے لکھتا ہوں

جہاں بھی ہو اُداسی
 آہی جاتی ہے خبرِ مجھ تک
 کسی تنہا مسافر کا
 پہنچ جاتا ہے سب رنجِ سفرِ مجھ تک
 جہاں جتنی بھی ہو تنہائی
 اُس کو دیکھ لیتا ہوں
 چھپی ہو جس قدر زیبائی
 اُس کو دیکھ لیتا ہوں

میں سن لیتا ہوں
 تھوڑی یا بہت جیسی ہو خاموشی
 سمجھ جاتا ہوں
 موسم سے ہوا کی نرم سرگوشی
 کسی آن دیکھی دنیا کے
 دریچے باز کرتا ہوں
 میں یہ سب جمع کر کے
 نظم کا آغاز کرتا ہوں

وہ کیا شے ہے

وہ کیا شے ہے
 جو بے مصروف ہر دم
 مجھ کو کھانے میں
 کبھی آہستہ آہستہ
 مرے دل کو کترنی ہے
 کبھی خون چاث کر میرا
 وہ اپنا پیٹ بھرتی ہے
 اگر کچھ کرنا چاہوں
 وہ مجھے کرنے نہیں دیتی
 یہ دن جو سخت خالی ہیں
 انہیں بھرنے نہیں دیتی

اکیلے ہی مرے اندر
 چھٹتی ہے بکھرتی ہے
 مجھے سب سے الگ رکھ کر
 بہت کمزور کرتی ہے
 پسند آتی نہیں اس کو کوئی بھی شے زمانے میں
 وہ اک شے جس کو عادت پڑ گئی ہے مجھ کو کھانے کی

ایک عجائب پرندہ

سفید اجلاء خیال کوئی
 عجائب پرندہ ہے
 بیٹھا رہتا ہے میرے سر پر
 پروں کو اپنے وہ کھوتا ہے
 تو پھیل جاتا ہے ایک سایہ
 تمام گھر پر
 نہشہرتی راتیں ہوں سردیوں کی
 کہ گرمیوں کے عذاب دن ہوں
 بہار کی دلبری ذرا سی
 کہ ہونخزاں کی بڑی ادائی

بڑی مزے سے

وہ بیٹھا رہتا ہے میرے سر پر
 اڑے تو مجھ کو بھی ساتھ اپنے
 اڑاتے پھرتا ہے بھروسہ پر
 کپڑنا چاہوں
 تو دُور رہتا ہے ہاتھ بھر پر

جب ملی تھوڑی فراغت
 وہ کہاں تھی
 اور کیسی تھی
 خبر کچھ ملتی رہتی تھی مجھے
 میرے ہونے کا
 اُسے بھی ملتا رہتا تھا سراغ
 کچھ عجیب حالات تھے
 دونوں ہی بس
 اپنی اپنی زندگی میں گم رہے
 اپنے غم اپنی خوشی میں گم رہے

جب ملی تھوڑی فراغت
 جا کے پوچھا اس کا حال
 یہ فراغت ڈھونڈنے میں
 لگ گئے چالیس سال

جو موسم قید کرتا ہے

جو موسم قید کرتا ہے
 ہوا کو باندھ رکھتا ہے
 پرندے پر اگر کھولیں
 تو ان کو کاٹ دیتا ہے
 ملائم دھوپ کی چادر
 سروں سے کھینچ لیتا ہے
 بغیر اُس کی اجازت کے
 شجر سایہ کسی کو دے
 تو وہ سایہ شجر سے توڑ لیتا ہے

کبھی رستے میں مل جائے
 مجھے آداب کرتا ہے
 ذرا سامسکراتا ہے
 جدا ہونے سے پہلے
 ہاتھ بھی مجھ سے ملاتا ہے
 ہمیشہ کی طرح اُس کی نشانی بھول جاتا ہوں
 میں دشمن کی کوئی صورت پرانی بھول جاتا ہوں

یہ دن بھی
 نامکمل دن بہت
 بکھرے پڑے ہیں
 میرے گھر کے آس پاس
 شہر کے ہر کوچہ و بازار میں
 روزمرہ زندگی میں
 عشق کے بیوپار میں
 جن کا چہرہ ہے نہ ہے کوئی سریر
 ہیں اگر وہ تو
 غلط کاموں پہ جیسے ہو لکیر
 میں سحر ہونے کے ساتھ
 ڈھونڈتا رہتا ہوں وہ لمبے
 کہ جس سے

اک مکمل دن بنانا ہے مجھے
 اس کا مصرف بھی دکھانا ہے مجھے
 اور وہ لمحہ نہ ملنے پر
 یہ دن بھی
 اس کے ہم صورت دنوں میں
 پھینک آنا ہے مجھے

مگر یہ سوچ کر.....

زوال عمر ہے
بیٹھا ہوں
اک تدبیر کرنے میں
کوئی منظر سہانا ہے
اُسے تنخیر کرنے میں
کہیں اک شہر ہے
اس شہر کو تعمیر کرنے میں
مگر یہ سوچ کر
خود کو ذرا دل گیر کرنے میں

وہ جس تغیر میں
 میرے لیے ہے دکھ بہت سہنا
 میں کیوں اس کو بناتا ہوں
 جہاں میں نے نہیں رہنا

کیا ہے فیصلہ میں نے

ضرورت بے ضرورت بولتے رہنا

یونہی ہر ایک سے کچھ پوچھتے رہنا

کسی سے پوچھنا

کیا حال ہے بھائی؟

یہ کیوں میرھی تمہاری چال ہے بھائی؟

تمہیں جوتا ستاتا ہے؟

تمہارے پاؤں کا ہر روز

کتنا ماس کھاتا ہے؟

مرا یہ مشورہ ہے پاؤں کٹوادو

نہیں تو جوتا اپنے سر کو پہنا دو

تنی گردن ہے جس کی

اور جو اکڑے بازو والے ہے
 میں اُس سے پوچھتا ہوں
 ٹو ہی رانی خاں کا سالا ہے؟
 سیاست داں سے کہتا ہوں
 تمہارا دھندا کیسا ہے؟
 سناء ہے اس میں
 بس پیسہ ہی پیسہ ہے
 بہت ہی سیدھے لوگوں کو
 بہت ہی خوار کرتے ہو
 کہ چج کا نام لے کر
 جھوٹ کا بیو پار کرتے ہو
 عجب عادت بنا رکھی تھی دل ہی دل میں جلنے کی
 یہی صورت پچھی تھی ایک میرے چج نکلنے کی

بہت مدت گذرنے پر

سنہری بال اُس کے
بن رہے تھے برف کی جھالر
وہ آنکھیں
ایک نیلی ڈھند جن میں تیرتی تھی
اس قدر رخالی
کہ وہ سوکھی ہوئی جھیلیں

وہ چہرہ
جس کی تابانی بہت بر باد کرتی تھی
بنا تھا راکھ کی ڈھیری
بہت مدت گذرنے پر
اچانک دیکھ کر مجھ کو

اُن آنکھوں میں
پرانی دھند جیسے پھر اُتر آئی

وہ چہرہ

ایک اندر کی چمک سے جگمگا اٹھا

کسی تنہائی نگر میں ہو
کسی لمبے سفر میں ہو
کہ قیدِ بام و در میں ہو
محبت اپنے گھر کو یاد رکھتی ہے
وہ اک دن لوٹ آتی ہے

دن گزرتے جا رہے ہیں

دن گزرتے جا رہے ہیں
 یوں مرے نزدیک سے
 ان کے چلنے کی صدا آتی نہیں
 ایک ہلکی گرد ان کے پاؤں کی
 جم رہی ہے کتنی خاموشی کے ساتھ
 میرے چہرے پر
 تری آنکھوں، تیرے رخسار پر
 مری جاں!..... اس گرد میں
 کتنے ذرے ہیں شریک
 عشق کو دشام کے
 ہم محبت پیشہ لوگوں پر کئی الزام کے
 ترے میرے درد سے آلو دصیح و شام کے

میری جاں!
 یہ گرد کچھ بھی سال میں
 بے مہری ایام سے
 دیکھنا کتنی سیہہ ہو جائے گی
 بلکہ یہی ذرے ہیں جن کی
 تیرے میرے چہرے پہ
 تھوڑی چمک رہ جائے گی

حبيب جالب سے.....

ظلم سے جو جنگ تھی کیسی لگی
یارِ من! یہ زندگی کیسی لگی

چ سے یارانہ نبھایا کس طرح
حرف حق سے دوستی کیسی لگی

حرف حق کو بر ملا کہنے کے بعد
ہاتھ میں پھر ہتھڑی کیسی لگی

پالیا گیا کیا جس کی اتنی تھی تلاش؟
عمر بھر آوارگی کیسی لگی

کیا پایا شاعری کا مجنزہ.....؟
لفظ کی جادوگری کیسی لگی

۱۹۹۵ء کی آمد پر

تقاضے پورے کچھ بھی آج شب کے کرنہیں سکتا
میں سالِ نو کا استقبال اب کے کرنہیں سکتا

جدھر بھی دیکھتا ہوں، ہے عجب اک در کی کیفیت
جو صحراؤں کی صورت ہے وہی ہے گھر کی کیفیت

اماں کا ایک گوشہ بھی نہیں اس میں کہیں یارو
مجھے یہ شہر اب بتا نظر آتا نہیں یارو

جسے خطرہ ہو لوگوں کے ذرا دل شاد ہونے سے
اُسے روکے گا کوئی کس طرح بر باد ہونے سے

خود کلامی

دیکھو!
 ایسے گھبرا نے سے
 اور دل چھوٹا کرنے سے
 یہ جو باقی عمر پڑی ہے
 کیسے کٹے گی؟
 یہ جو پیچھے رہ جانے کا پچھتاوا ہے
 اپنے ضائع ہونے کا دکھ جواتا ہے
 یہ سب کیا ہے؟
 اس پر ٹھنڈے دل سے کبھی کیا سوچا ہے؟
 کتنی دفعہ انصاف سے خود کو پرکھا ہے؟
 کتنے پانی میں ہو
 کبھی یہ دیکھا ہے؟

ایک دفعہ ہمت سے ایسا کر لیتے
 یہ بے کار کے دکھ
 جو تمہیں کھاتے رہتے ہیں
 ان کا مداوا کر لیتے

کرنے والے کچھ کام

مرا خود سے کوئی رشتہ پرانا ہے
 یہ کب ٹوٹا، یہ کیوں ٹوٹا
 سراغ اس کا لگانا ہے
 یہ تہائی
 مرے اندر بہت ہی شور کرتی ہے
 اسے اب چپ کرانا ہے
 یہ بے چینی
 جو لمجھے دل میں چھید کرتی ہے
 یہ کس جانب سے آتی ہے؟
 ذرا اس سمت جانا ہے
 اُداسی میں جوزردی ہے

یہ کس نے
 دل کے ہر موسم میں بھر دی ہے؟
 کہاں ہیں دوسرے سب رنگ
 ان کو ڈھونڈنا لانا ہے

چہروں میں ایک چہرہ

کھڑکیوں کی اوٹ سے
 ڈھونڈتی رہتی ہیں دو آنکھیں
 بھرے بازار میں
 ان گنت چہروں میں وہ چہرہ
 انہیں جو دیکھ لے
 اور پڑھ لے ان میں اک تحریر کو
 پڑھ کے آئے اُس کے پاس
 وہ کہ جو ہے
 ایک مدت سے اداں
 ساتھ لے جائے
 گھمائے شہر میں
 اور نہلائے اُسے

رنگوں کی بہتی نہر میں
 اس طرح پھر چھوڑ بھی جائے اسے
 اس کی تہائی میں جیسے
 کوئی بھی آیا نہ تھا
 اس کو کھونے کا مگر کچھ غم بھی ہو
 جو کبھی پایا نہ تھا

افتخار نسیم کے لیے

میں آج خوش ہوں
 بہت ہی خوش
 یہ راز پا کر
 کہ مرد کہتے ہیں لوگ جس کو
 تم اس کا رد ہو
 اگر چہ پشم جہاں میں بد ہو
 مری نظر میں دراز قد ہو
 جو بات کہنے لگا ہوں
 اتنی ہے محrama نہ
 سوا تمہارے
 کبھی کسی سے نہ جا سکے گی

دبائے رکھی ہے
 میں نے مدت سے ایک خواہش
 ذرا سا مجھ پہ کرم کر تو
 وہ اپنی آسودگی کی منزل کو پاسکے گی

دیر تک سونے والا

رواں ہوں یوں
 کہ اپنی تیز رفتاری سے
 خود ہی ڈر رہا ہوں میں
 بہت پہلے
 مجھے جو کام کرنے تھے
 انہیں اب کر رہا ہوں میں

اک اور نام

اک اور نام
 دل سے مٹانا پڑا مجھے
 اک اور رشتہ پیار کا
 یک لخت کٹ گیا
 اک دوست گھٹ گیا
 کیا مل گیا ہے
 بات کوئی کھول کے مجھے
 اس عرصہ دروغ میں
 چ بول کے مجھے

دن سے میرا وعدہ

اتر کر رات سے
 جب دن مرے کمرے میں آتا ہے
 مجھے آ کر جگاتا ہے
 میں اس سے وعدہ کرتا ہوں
 کہ اس کو رائیگاں ہونے کے ذریعے
 دور رکھوں گا
 اسے مصروف رکھوں گا
 کسی دیوارِ زندگی میں
 کہیں اک در بنانے میں
 کوئی مرتی ہوئی نیکی بچانے میں
 رُکا ہے دیر سے کارِ وفا
 اس کو چلانے میں

اُسے مصروف رکھوں گا
 کسی طاقِ فراموشی پر
 اپنے ماضی و فردا کو دھرنے میں
 فقط موجود لمحے میں
 بسراوقات کرنے میں
 بہت سی سرد سینوں میں
 بہت سی دھوپ بھرنے میں

مگر جب شام کو
 دن اپنے ہی اندر سمجھتا ہے
 وہ میری سمت تکتا ہے
 اور اس کے خالی ہاتھوں میں
 مری وعدہ خلافی کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتا

سوچتا ہوں

ایک پرندہ
 مرے کمرے کی کھڑکی میں آیا
 اور گانے لگا
 مرادل اُس کے پیار سے بھر گیا

 بھری دھوپ میں
 بادل کا ایک ٹکڑا
 مر ہے سر پر آیا
 اور میرے ساتھ چلنے لگا
 میں نے اُسے محبت بھری نظر وں سے دیکھا

ہوا کا ایک خنک جھونک آیا
 اور مرد بدن سہلانے لگا
 میرا جی چاہا
 وہ مجھ سے یوں ہی لپٹا رہا ہے

سوچتا ہوں
 ایک بڑی خوشی کے انتظار میں
 میں چھوٹی چھوٹی خوشیاں
 کیوں ضائع کرتا رہا

نظم کہاں سے شروع کروں

میں نے عراق پر نظم لکھنی ہے
 سوچتا ہوں کہاں سے شروع کروں
 بیرونیہما سے یانا گا ساکی سے؟
 اسے ویت نام میں دس سالہ
 سامراجی بربریت سے بھی شروع کیا جا سکتا ہے
 بوسنیا میں قتل عام
 اور فلسطینیوں کا اہو بھی
 نظم کے آغاز میں مددے سکتا ہے
 پھر نظم کا پیٹ بھرنے کے لیے
 معلوم کرنا پڑے گا
 کہ ان جنگوں میں کتنے لوگ مارے گئے
 کتنی عورتیں بیوہ ہوئیں

اور کتنے بچے قیمتی کی گود میں چلے گئے
 زخمی اور اپاہجوں کو بھی
 نظم میں جگہ دینی پڑے گی
 یہ جاننا بھی ضروری ہے
 کہ کتنے گھر تباہ ہوئے
 اور ان میں کتنے خواب دفن ہو گئے
 نظم کے آخر میں یہ بھی دیکھنا ہے
 کہ ان جنگوں میں انسانیت کا کیا بنا
 مگر انسانیت کا ذکر کیسے آ گیا
 وہ تو عرصہ ہوا ہمیں چھوڑ چکی ہے
 اس یقین کے ساتھ
 کہ ہم اپنی واپسی کے راستے پر چل پڑے ہیں

وہ عورت

ایک بو سے نے مجھے محبت سکھا دی
 یہ بہت سال پہلے کی بات ہے
 وہ عورت اب کہاں ہے؟

مجھے معلوم نہیں
 نہ اُس کے بارے میں
 کسی سے کبھی کچھ سنا ہے
 لیکن اُس کا بو سہ
 آج بھی
 میرے ہونٹوں پر تازہ ہے
 جس کے ذائقے نے
 میری زبان میں رس بھر دیا ہے

میرے لفظوں کو میٹھا بنادیا ہے
اور مجھے لوگوں سے
محبت کرنا سکھا دیا ہے

کاش وہ عورت
ایک بار پھر کبیس مل جائے
اور میں اُسے بتا سکوں
کہ اُس کے ایک بو سے نے
میری زندگی کو
کس قدر کار آمد بنارکھا ہے

بھٹو کے لیے دو نظمیں

(1)

موت نے اُس کی آنکھوں میں دیکھا
 وہ اپنا بوسیدہ بدن ہاتھ میں لیے
 اس کے استقبال کو کھڑا تھا
 وہ ڈرگئی
 وہ اُس کے قاتلوں کے پاس گئی
 اور جو دیکھا تھا انہیں بتا دیا
 وہ سمجھے موت ان کے خلاف
 کسی سازش میں شامل ہو گئی تھی
 ان کا شک ڈور کرنے کے لیے
 وہ اس کا بدن ان کے پاس لے آئی

مگر جاتے وقت نصیحت کر گئی
 کہ اسے سنبھال کر رکھیں
 اُس دن کے لیے
 جب آدمیوں کا قحط پڑ جائے گا
 اور اُسے زندہ کرنے کے سوا
 اور کوئی چارہ نہیں ہو گا

(2)

ذراسنو
 یہ اُس کے قدموں کی آواز ہے
 اپنے گھروں کے دروازے گھلے رہنے والے
 وہ آتا ہے
 مگر انہیں بند پا کر
 واپس چلا جاتا ہے

دیکھو!

وہ آرہا ہے
 ایک ہاتھ پر اپنا

اور دوسرے ہاتھ پر
 اپنے دونوں بیٹوں کے سر رکھے ہوئے
 وہ تم سے کچھ مانگنے نہیں آیا
 کوئی شکایت کرنے نہیں آیا
 صرف پوچھنے آیا ہے
 قیمت
 اپنے اور اپنے بیٹوں کے سروں کی
 تم کیسے لوگ ہو
 دروازہ کھولتے ہی نہیں
 اپنے آسودہ گھروں سے
 نکلتے ہی نہیں۔

ہم سے پوچھا جاتا ہے

ہم سے پوچھا جاتا ہے
 جب ظلم ہو رہا تھا
 تو ہم خاموش کیوں تھے
 ہم نے ظلم کرنے والا رہا تھا پکڑ کیوں نہ لیا
 اُسے توڑ کیوں نہ دیا

ہم سے پوچھا جاتا ہے
 جب انقلاب ہمارے دروازے پر
 دستک دے رہا تھا
 تو ہم کہاں تھے
 ہم نے دروازہ کیوں نہ کھولا
 اس کا استقبال کیوں نہ کیا

ہم کیا کہیں
 یہی سوال ہم خود سے بھی پوچھتے رہتے ہیں
 اور سوچتے رہتے ہیں
 ہم اس کا جواب دینے کے قابل کب ہوں گے

غزلیں



جو خاک میں ہے ملا ہوا سر رہ گلاب گرا ہوا
ذرا دیکھنا کبیں یہ نہ ہو ترا میرا خواب گرا ہوا

کبیں شب کی گدلي سی نہر میں تھے آب چاند ہے سرگنوں
کبیں میلی صبح کے جو ہڑوں میں ہے آفتاب گرا ہوا

ترے پانیوں میں چمک تو ہے ترے پانیوں میں اثر نہیں
مجھے لگ رہا ہے کہ ان میں ہے کبیں اک سراب گرا ہوا

کسی کو خبر نہیں کیا ہوا مرے بعد شہر خیال میں
میں پلت کے آیا تو ہر مکاں تھا تباہ، خراب، گرا ہوا

کبھی ظلمتوں کی اتھاہ میں کسی روشنی کا گماں کوئی
کبھی ریگ زاروں کے وسط میں کوئی عکس آب گرا ہوا

ترے منظروں میں جو رنگ ہے اسے بھرنا تیری پسند ہے
کہیں چھینٹ بھی نہیں عورتک، کہیں بے حساب گرا ہوا

یہ جو زندگی کی کتاب ہے، اسے جمع رکھنا عذاب ہے
ترے غم کا جس میں حساب ہے، کہیں ہے وہ باب گرا ہوا

O

درد کسی کا لے کر اپنی ذات میں رکھنا ہے
ایک چمکتی شے کو اندھیری رات میں رکھنا ہے

ڈھونڈ رہا ہوں ارضِ خدا پر جتنی جگہ بے میری
سوچ رہا ہوں خود کو کہاں حالات میں رکھنا ہے

اور تو کچھ نہیں کہنا سننا اس سے بچھرتے لمح
ٹوٹا ہوا اک وعدہ اُس کے باتھ میں رکھنا ہے

دل جو مانگے دے دوں گا میں، یہ تو نہیں مشکل
مشکل یہ ہے پھر اس کو اوقات میں رکھنا ہے

پت جھڑ نے جو کچھ کرنا ہے، یہ اس کا ہے کام
میرا کام ہری رنگت ہر پات میں رکھنا ہے

تیری آنکھوں جیسا نیلا، گہرا اور بوجل
ایسا اک بادل اب کے برسات میں رکھنا ہے
اب کے اسے ملنے جاؤ تو یاد رکھو شاہیں
اپنا مطلب اپنی کس کس بات میں رکھنا ہے

O

دنیا میں رہ کے ذات سے دنیا نکال دوں
سوچا ہے یہ بھی آخری کانٹا نکال دوں

آساں ہو سب کے واسطے پہچاننا مجھے
چہرے میں جو ہے دوسرا چہرہ نکال دوں

یا چل پڑوں سفر پہ گرہ ڈر کے کھول کر
یا پھر سفر سے پورا ہی رستہ نکال دوں

ملنا ملانا اُس سے تو چلتا رہے یونہی
بس درمیان سے کوئی وعدہ نکال دوں

جتنی ہیں خواہشیں انہیں دھوڈالوں ایک بار
کچا ہے انہیں رنگ جو سارا نکال دو

اک تازہ عہد کے لیے ان ماہ و سال سے
ماضی نکالوں حال کہ فردا نکال دوں

ویسے تو ٹھیک ٹھاک ہے پوشک زندگی
اک یاد کا پھٹا ہوا ٹمکڑا نکال دوں

چمنا ہے بادبائی سے جو طوفان اتار دوں
بیٹھا ہوا سفینے میں دریا نکال دوں

دیکھا نہ جائے دیکھنا پڑتا ہے جو یہاں
بہتر ہے شاہیں پشم تماشا نکال دوں

O

موج بلا نہبہ گئی ایک عذاب رہ گیا
عمر گذارنے کو اب شہر خراب رہ گیا

چلنے سے پہلے پچھلی شب رخت جودیکھا کھول کر
رات کے طاق پر کسی صبح کا خواب رہ گیا

رنگِ شفقت اتر گیا شام کے رخ سے کس طرح
راہِ بہار میں کہاں تھک کے گلاب رہ گیا

چہرے کی سب عبارتیں چہرے ہی میں چھپی ہیں
آنکھ کے انتظار میں حرفِ کتاب رہ گیا

سننے سے پہلے اس کی بات جانے بکھر گئی کہاں
تیز ہواؤں میں کہیں میرا جواب رہ گیا

دریا جو چپ ہے اس قدر دیتا نہیں ہے کچھ خبر
پانی ہے یا کہ سطح پر صرف سراب رہ گیا

دن جو گذر رہے ہیں اب، سادہ ورق ہیں سب کے سب
لکھنا ہے میں نے ان پر کب، کون سا باب رہ گیا



کوئی رُتِ ادھر سے چلی گئی کسی دوسری کا قیام ہے
اسی آنے جانے کے درمیاں یہاں زندگی کا قیام ہے

یہ جو پانیوں کا بہاؤ ہے، یہ جو پربتوں کا پڑاؤ ہے
کہیں شور اپنے سفر میں ہے کہیں خامشی کا قیام ہے

یہ جو دن ہے اور یہ جو رات ہے یونہی نام رکھنے کی بات ہے
کہیں روشنی ہے رُکی ہوئی کہیں تیرگی کا قیام ہے

تجھے بے تحاشا ہی سوچنا، نئے دین کی ہے طرح کوئی
تجھے ایسے ٹوٹ کے چاہنا کسی بندگی کا قیام ہے

وہ بجھی بجھی مری خلوتیں، تھا شمر وہ تیرے فراق کا
یہ جواب ہیں اتنی اداسیاں، یہ بھی ہجر ہی کا قیام ہے

کسی بے یقین سی زمین پر تو کھڑا ہے مجھ سے ذرا پرے
کوئی شک ہے جس کے نواح میں ترمی دوستی کا قیام ہے

یہاں جس کے ہاتھ جو آ گیا، اُسے اپنا اُس نے سمجھ
یہاں جس کو جتنی جگہ ملی وہاں پر اُسی کا قیام ہے



یہ کیا کہ محبت کے عذابوں ہی میں رہنا
ملنا تو بچھرنے کے حسابوں ہی میں رہنا

کچھ سوچتے رہنا کسی خلوت میں اتر کر
چپ اوڑھنا اور دل کے خرابوں ہی میں رہنا

جانا کبھی باہر بھی اداسی کو منانے
باغوں میں مگر زرد گلابوں ہی میں رہنا

یہ کیا کہ سدا ریت میں گاڑھے رہو کشتی
رہنا بھی تو پایاب سے آبوں ہی میں رہنا

میرے لیے کس کام کا وہ حرفِ محبت
جس حرفِ محبت نے کتابوں ہی میں رہنا

ایسا بھی نہیں ہے کہ حقیقت سے کہیں دور
اک لطف سا لینے کو سرابوں ہی میں رہنا

یہ دیکھنا کس سمت سے آیا ہے کوئی سنگ
مصروف بہت اس کے جوابوں ہی میں رہنا

یہ سوچتے رہنا کہ میں ہوں یا کہ نہیں ہوں
بس ٹوٹتے اور بنتے حبابوں ہی میں رہنا

ملنی نہ رعایت کبھی دنیا کی طرف سے
تھوڑی سی خطا پر بھی عتابوں ہی میں رہنا

گھل جائے نہ مجھ پر کوئی میری ہی حقیقت
اس خوف سے بچنے کو نقابوں ہی میں رہنا

اک پل کے لئے دینا نہ دم لینے کی مہلت
دم لینا اگر، پاؤں رکابوں ہی میں رہنا

بہتر ہے ترے واسطے اے صورتِ زیبا
کچھ دیر ابھی اور جوابوں ہی میں رہنا

اب جانے سونے میں یہی فرق ہے شاہیں
خوابوں سے نکنا بھی تو خوابوں ہی میں رہنا

O

کہوں کس سے کہ کیا باقی نہیں ہے
بدن تو ہے قبا باقی نہیں ہے

جو رویا تھا جدائی پر ہماری
وہ تارا شام کا باقی نہیں ہے

بہت مشکل ہے اب کے پچ نکنا
کوئی بھی راستہ باقی نہیں ہے

کروں کیا آنکھ جو خالی ہے اتنی
کہ اب کچھ دیکھنا باقی نہیں ہے

وہی ہے جبر اور میں بھی وہی ہوں
مگر وہ حوصلہ باقی نہیں ہے

اُسے تو کیوں بُرا کہتا ہے شامیں
ترا کوئی گھر باقی نہیں ہے

O

کہا اک سفر تو نیا وہیں اختام پہ رکھ دیا
مجھے کس نے روزِ ازل سے ہی رو نام تمام پہ رکھ دیا

ہے وہ کس جگہ جو بہار ہا ہے ستارے رات کے نیل میں
جونبی ماہتاب طلوع ہوا اسے آب شام پہ رکھ دیا

جو تری جدائی کا داغ ہے مرے پاس بس یہ چراغ ہے
سر شام گھر میں جلا لیا ہوئی شب تو بام پہ رکھ دیا

کیا کارِ عشق تمام جب، جو تھا اس میں جھوٹ وہ سب کا سب
کہیں اپنی ذات پہ لے لیا کہیں ترے نام پہ رکھ دیا

یہ جو خلق مجھ سے خفا ہوئی کہوں کس طرح جو خطا ہوئی
یہاں جس کا جتنا مقام تھا اسے اس مقام پہ رکھ دیا



اُس نے دھکیلا اس قدر دیوار کی طرف
تگ آ کے ہاتھ انٹھ گیا تلوار کی طرف

اک آنکھ تھی کہ ہر گھڑی تھی نقدِ جیب پر
اور دوسری تھی گرمی بازار کی طرف

لیئے تھے سائے گھاس پر اور ان کے پاس ہی
ستا رہی تھی دھوپ بھی اشجار کی طرف

دھڑکا لیے پسند کا اور ناپسند کا،
تکتی ہیں چیزیں چشمِ خریدار کی طرف

اک جھوٹ اس سے بولا تھا اس نے پکڑ لیا
پھر کیسے دیکھتا میں رخ یار کی طرف

میلہ ہے قتل عام کا شاہیں لگا ہوا
اثھینے کہ تھوڑی سیر کریں دار کی طرف



اچاٹ پھر ہوا دل گھر سے، گھر میں کیا پایا؟
سفر میں اس قدر خوش ہو سفر میں کیا پایا؟

یہ دن ہی ایسے ہیں ان میں حساب کرتے رہو
کہ کھویا شام کو کیا اور سحر میں کیا پایا

ہوئی ہے خوب فراواں حیاتِ بے مصرف
سوائے کثرتِ آدم نگر میں کیا پایا

انھا رہے ہو بہت آندھیا بدن اندر
بس اپنے آپ سے لڑتے ہو، سر میں کیا پایا

وصول کرتے رہیں دادِ شعر شاہیں جی
مگر یہ سوچئے عرضِ ہنر میں کیا پایا

O

کہنے کو یوں بھلانہ کیا میرے ہنر کے پاس تھا
کہنے کے ساتھ ہی مگر بھی سر کے پاس تھا

یہ کیا ہوا کہ اٹھ گیا چیزوں سے اعتبار ہی
کوئی فریب ہر گھڑی جیسے نظر کے پاس تھا

آنکھ جو نیند سے گھلی شام تھی سامنے کھڑی
اور سفر پڑا ہوا راہ گذر کے پاس تھا

جیسا تھا مختوں کا پھل، جاتا کہاں ہے سب کا سب
دیکھا تو دستِ بے ہنر شاخِ ثمر کے پاس تھا

بند تھا یا کھلا تھا گھر، آتی نہیں تھی کچھ خبر
اور میں کب سے منتظر دستک در کے پاس تھا

شاہیں گلوں کے قتل کا مجھ پہ غلط نہ تھا شبہ
تحوڑا لہو گرا ہوا میرے بھی گھر کے پاس تھا

O

اک پختہ داغ رات دن دھونے سے کم ہوا
دل پر عجیب بوجھ تھا روئے سے کم ہوا

پھر یوں ہوا کہ جینے کا بڑھتا ہوا عذاب
خود سے ذرا سا بے خبر ہونے سے کم ہوا

اب کیا بتاؤں دل کی زمیں کا سیاہ پن
کتنے شر کہاں کہاں بونے سے کم ہوا

رنگِ بہار کیسے اڑا صحنِ باغ سے
پہلے ذرا ذرا کسی کونے سے کم ہوا

شاہیں خمارِ خوں تھچا کہ زر کا خمار تھا
آخرِ بدن میں خار چھونے سے کم ہوا

O

وہ جو ایک تارا تھا رات میں وہی جل گیا مرے سامنے
میرا سچ بھی میرا نہ بن سکا کہ بدل گیا مرے سامنے

کسی سوچ میں میں پڑا رہا، مرا کام سارا دھرا رہا
ابھی دن چڑھا مرے دیکھتے ابھی ڈھل گیا مرے سامنے

کسی درد سے تھی بھی دکان مجھے لینا پڑ گیا کچھ وہاں
کوئی بچہ تھا مری ذات میں وہ مچل گیا مرے سامنے

اُسے دیکھتا رہا کیوں بھلا، اُسے بڑھ کے کیوں نہ پکڑ لیا
کوئی لمحہ میرے ہی ہاتھ سے یوں نکل گیا مرے سامنے

ابھی دن کے بننے میں دیر تھی، ابھی تازہ سوری تھی
کوئی ہاتھ تھا کہ سیاسی پھر وہاں مل گیا مرے سامنے



یہ اُس نے عمر بھر کیسے ملال میں رکھا
کہ میرے عہد کو عہدِ زوال میں رکھا

پھاڑ، ابر و ہوا، بحر و بر، شجر کیا ہیں
یہ اس نے بتلا کیسے سوال میں رکھا

بنانی شب بھی ضروری تھی، پرنہ اتنی دراز
بہت ہی فاصلہ صحِ جمال میں رکھا

میں مانتا ہوں محبت میں بھی خیانت کی
خیال اور اک اُس کے خیال میں رکھا

ملا جو اُس سے ضروری تھی بدگمانی بھی
کہیں پہ داغ سا ماہ وصال میں رکھا

کسی بھی رت کو اجازت نہ تھی خبر نے کی
خلل عجیب سا کوئی ماہ و سال میں رکھا

عجیب چیز ہوں خوش ہوں جہاں ہوں جیسا ہوں
کہ میں نے مااضی بھی فردا بھی حال بھی رکھا

فلک کے نیل کو پہلے روای کیا اُس نے
پھر اُس نے چاند کو تاروں کے جال میں رکھا

وہ جس نے بخشی ہیں مجھ کو فراغتیں شاہیں
اُسی نے جینا بھی کارِ محال میں رکھا



وہم سے دور اور گماں سے پرے
آسمان اک ہے آسمان سے پرے

جس کا کوئی فلک بنا ہی نہیں
اک زمین اور ہے یہاں سے پرے

لامکاں تک اگر پہنچ بھی گیا
پھر کدھر جاؤں گا وہاں سے پرے

عبدِ بے گانگی میں وہ مجھ سے
ہو گیا ہے کہاں کہاں سے پرے

ایسی بدلی ہے بود و باش یہاں
گھر بنانا پڑا مکاں سے پرے

سو رہا ہے سفینے میں دریا
اور ہوا چپ ہے بادبائ سے پرے

بات کرتا ہے پچھلی شب مجھ سے
اک ستارہ ہے آسمان سے پرے

منہ کیلا ہے ان سے کیوں شاہیں
لفظ رہتے ہیں جوزبائ سے پرے

O

پھر جانے کیا ہوا کہ کچھ سوچ کے در میں رک گئی
سارے مکیں چلے گئے ایک وہ گھر میں رک گئی

تیری مری اداسیوں کی رُت تو ایک تھی مگر
تجھ سے پرے گذر گئی میری نظر میں رک گئی

خواب طرب وہ رات کا، یاد ذرا سا رہ گیا
یاد بھی یوں کہ اس کی راکھ رنگِ سحر میں رک گئی

کوششِ صد کے باوجود دھیان کہیں نہ بٹ سکا
بات ذرا سی تھی مگر ایسے ہی سر میں رک گئی

پھر میں تمام شب رہا دستکِ در کا منتظر
پیروں کی چاپ تھی کوئی، آ کے جو در میں رک گئی۔

برگ و شمر کو ہر گھنٹی چاث رہی ہے شے کوئی
اب کے تو یوں لگا خزاں جیسے شجر میں رک گئی

طبع میں شاہیں اب نہیں پہلی سی وہ رواییاں
بہتی ہوئی ندی کوئی جیسے سفر میں رک گئی



میرے دل کا اک راز ہے یہاں دوسرے پہ کھلا ہوا
مجھے شک ہے میرا ہی دوست ہے مرے دشمنوں سے ملا ہوا

وہ جو ابتدائے بہار میں، تھی بہت ہی صاف قبائے گل
پھر اسی قبا پہ جگہ جگہ، تھا خزاں کا رنگ گرا ہوا

بڑی مدتؤں سے پڑا ہوں میں کہیں صبح و شام کے درمیاں
میں کہ سورجوں کا جلا ہوا میں کہ تیرگی کا ڈسا ہوا

تری ہی عبادتِ دل کوئی ترے چہرے پہ تھی لکھی ہوئی
مری آنکھ جس پہ رکی رہی کوئی حرف تھا وہ منٹا ہوا

میں وہ جنس ہوں یہاں پیار کی جو ملے کسی کو کبھی کبھی
مجھے خرچ کر ذرا سوچ کر میں بہت ہی کم ہوں بچا ہوا

یہ جو سلسلہ ہے معاش کا، ہے عجیب یہ بھی معاملہ
جہاں رزق ہے مرا منتظر وہیں دام بھی ہے بچھا ہوا

ملے وقت تو مجھے ڈھونڈ لے میں جہاں ملوں تجھے جس قدر
مجھے خود بھی کوئی خبر نہیں میں کہاں کہاں ہوں بنا ہوا

وہ ملامتوں کی جو راہ تھی جہاں سنگ کھا کے گرا تھا میں
وہیں خاک پر مرے پاس ہی ترانا نام بھی تھا پڑا ہوا

کسی سوئے درد کی چھیڑنا ملیں جب بھی عشق میں فرصتیں
یونہی بیٹھے بیٹھے کریدنا کوئی زخم کب کا بھرا ہوا

ہوئی کیسے پل میں نخوش وہ جو زبان زیادہ ہی تیز تھی
اسے کس نے کاٹ کے رکھ دیا، تھا جو ہاتھ حد سے بڑھا ہوا

وہ جو نقش سب سے قدیم ہے، وہ جو اسم سب سے عظیم ہے
کہیں پر بتوں پہ بنا ہوا، کہیں پانیوں پہ لکھا ہوا

جو طریقہ اس کا ہے دین کا، کرے کس سے اس کا کوئی گلہ
مجھے آنکھ بخشی تو نم بھری مجھے دل دیا تو دکھا ہوا



گھری یہ گھروں میں بخہرنے کی ہے
کہ باہر جوڑت ہے بکھرنے کی ہے

نبیس مانگنے میں یہاں عار کچھ
مگر شرط تھورا سا مرنے کی ہے

میں خوش ہوں کہ تھوڑا بہت ہے مجھے
یہ سب بات نیت کے بھرنے کی ہے

چلے آئیں گے دیکھنا لوگ خود
تماشا کوئی دیر کرنے کی ہے

پڑا ہے جو دل کے کنارے پہ خس
نشانی یا پانی اترنے کی ہے

جو سچ کہہ چکا ہوں، کسی طور اب
مجھے فکر اس سے مکرنے کی ہے



شور کرتی موج کو اُس کی روانی سے الگ
کر رہا ہوں اک جگہ پانی کو پانی سے الگ

یہ جو ملنا ہے ذرا سا کیا خبر یہ بھی نہ ہو
میرا جانا اب کے ہے نقلِ مکانی سے الگ

گفتگو کو یوں نہ دانسته غلط سا موز دے
وہ جو قصہ ہے وہ ہے میری کہانی سے الگ

لفظ جو کچھ ایسے بھی ہیں جو میرے بس میں ہی نہیں
بولنے لگتے ہیں میری بے زبانی سے الگ

دکھ ہے جس کا وہ نہیں عمر کی لا حاصلی
رایگانی ہے کوئی اس رایگانی سے الگ

دیکھنا پہلتے ہوئے کشتِ تمنا ڈور سے
شغل ہے صحرائے دل کی باغبانی سے الگ

ڈھونڈتے رہنا زمیں پہ پاؤں رکھنے کی جگہ
کرتے رہنا خود کو اپنی بے مکانی سے الگ

اپنی ہی نظروں سے گر جانا سبب کوئی بھی ہو
موت ہے اک یہ بھی مرگِ ناگہانی سے الگ

تاک میں ہے پیڑ کب اس کو گردے شاخ سے
لڑتی رہی ہے ہوا برگِ خزانی سے الگ

بڑھ رہا ہے روز شاہیں میرا اُس کا اختلاف
بات کوئی اور بھی ہے بدگمانی سے الگ



کوئی پوچھ لے تو بتاؤں کیا مرے دل سے کیوں وہ اتر گیا
مرے سامنے کوئی بات کی مرے سامنے ہی مکر گیا

یوں نہ کارِ عشق تمام کر یوں نہ صحِ شوق کی شام کر
وہ جو واقعہ تھا وہ ہو گیا وہ جو سانحہ تھا گذر گیا

کوئی آنکھ میری طرف نہ ہو کسی کو ذرا بھی خبر نہ ہو
مجھے جب بکھرنا پڑا کبھی کہیں دُور دل میں بکھر گیا

مرے روز و شب تھے بندھے ہوئے مرے موسموں کے مزاج سے
کبھی ایک لمحہ بھی سال تھا کبھی سال پل میں گذر گیا

مرے ساتھ ہی بڑی دور تک چلا جا رہا تھا جو سیدھ میں
وہی راستہ ذرا گھوم کر کبیں وادیوں میں اتر گیا

بڑا خوش کلام وہ شخص تھا، نہ پتہ چلا مجھے وقت کا
رہا ہم سفر ذرا دیر پھر کبیں راستے میں نہ سمجھا گیا

مجھے یاد پھر سے دلا گیا مری بھولی بسری محبتیں
یونہی دفعتہ کسی موز پر مجھے دیکھ کر وہ گذر گیا

بڑی دیر تک جو برس گیا کوئی ابر تھا وہ بہار کا
مرے گھر کے پاس نشیب ہے نئے پانیوں سے وہ بھر گیا



سکوتِ شب میں چلنے کا اشارہ رک گیا ہے
کبیں دریا کبیں اس کا کنارہ رک گیا ہے

کہاں اور کس طرح بنتا ہے دن، یہ دیکھنے کو
کنارِ آخرِ شب اک ستارہ رک گیا ہے

نظر ہتھی نہیں ہے سرخ تختہ ہائے گل سے
اسی منظر میں جیسے حسن سارا رک گیا ہے

محبت اب جو پج جائے گی اس کا کیا کریں گے
یہ طے ہے آج سے ملنا ہمارا رک گیا ہے

تعلق میں جو بے مہری ہے اس سے لگ رہا ہے
دلوں میں جیسے کوئی برف پارہ رک گیا ہے

جہاں بانی سے تھک کر لوگ اب بے سدھ پڑے ہیں
فصیلِ شب کے آگے دن کا دھارا رک گیا ہے

یہاں سے اب پلٹ جائیں یہ ممکن ہی نہیں ہے
بہت آگے کہیں جا کر اشارا رک گیا ہے

پڑا تھا بند کب سے کاروبارِ عشق شاہیں
چلا�ا تھا دوبارہ پھر دوبارہ رک گیا ہے



کیا بند جلدی سے در شام کا
پڑا تھا گھلا کوئی زر شام کا

بنا کر منانے میں مصروف ہے
کئی نقش دست ہنر شام کا

دھری دن کی ساری مسافت جہاں
اٹھایا وہیں سے سفر شام کا

وہیں سے اندر ہرے نے یلغار کی
گھلا رہ گیا کوئی در شام کا

نکتا ہے کیسا ادھورا سا دن
محر کے ہیں پاؤں نہ سر شام کا

ہیں محو سفر جس پہ یہ دن یہ رات
اس راہ سے ہے گذر شام کا

میں تھا دھوپ کے آخری موز پر
اور اس سے پرے تھا نگر شام کا

کہیں سرخ سا ہے کہیں ہے سیہ
عجب ہے فریبِ نظر شام کا

کچھ اس درجہ گہری تھی شاہیں شفق
کہ آتش یہ جیسے ہو گھر شام کا



نظر آتا نہیں کچھ ذات آگے
نفی ہے یا کہ ہے اثبات آگے

پکڑ لینا ابھی مشکل نہیں ہے
ذرا چل کر کھڑی ہے بات آگے

ہوا میں دندناتی پھر رہی ہیں
لگ رکھے ہیں سوکھے پات آگے

کسی کو کچھ اگر دینا بھی چاہوں
تو ہوتا ہے مرا ہی ہاتھ آگے

دبا رکھا ہے دن کو درمیاں میں
کہ پچھے رات ہے اور رات آگے

یہاں تک تو مناسب جی لیا ہے
کروں کیسے گذر اوقات آگے

جنہیں پہلے بسر میں کر چکا ہوں
کھڑے ہیں پھر وہی لمحات آگے

تعاقب لمحہ لمحہ ہو رہا ہے
بڑھی جاتی ہے کائنات آگے

جسے دیکھو وہ دوڑا جا رہا ہے
کہیں بٹنے کو ہے خیرات آگے

ہوا تھوڑی سی ہے نم دار شاہیں
یہ لگتا ہے کہ ہے برسات آگے



کارخانہ شب کو محو ہوں چلانے میں
ساری رات لگتی ہے ایک دن بنانے میں

شام کا کوئی منظر دیکھتا رہا رک کر
جیسے کوئی جلدی تھی روشنی کو جانے میں

ڈوبتا ہوا سورج کچھ سنہری سکے سے
روز ڈال جاتا ہے شام کے خزانے میں

ختم سب کچھ ہونے پر سوچتا ہوں اب اکثر
ہرج کیا تھا خود چل کر اس کے پاس جانے میں

ڈور سے تو اتنا ہی بس دکھائی دیتا ہے
چیز ہے یہ کوئی اک سفید خانے میں

اک بڑی اداسی میں گھومنا ہے تھوڑے دن
وقت لگ ہی جاتا ہے بات کو بھلانے میں

کون سی ندامت تھی جس کے بوجھ سے اس نے
دیر اس قدر کر دی آنکھ کو اٹھانے میں

سوچتا ہوں اب مجھ کو اُس خوشی سے کیا لینا
عمر لگ گئی جس کو ڈھونڈنے میں پانے میں

میں نے بھی نہیں پوچھا وہ بھی چپ رہا شاہیں
مصلحت کہیں کچھ تھی بات اک چھپانے میں

۶

دے رہا ہے کام وہ ایسا میں کرنے سے رہا
روز اور دن کے لیے اجرت پر مرنے سے رہا

جانے والے پر یہ کیا تمہت لگا جیسے ہو تم
اب تمہارے گھر میں کوئی پاؤں دھرنے سے رہا

پاس ہو زر کس قدر تو ہے یہ اک وجہ سکون
کچھ تعلق اس کا بھی نیت کے بھرنے سے رہا

بات ہے چوری کی یوں اُس کی صفائی میں نہ بول
رنگ اُس کے ہاتھ سے ایسے اترنے سے رہا

میں مقابل ہوں تو بہتر ہے کوئی طوفان اٹھا
یہ جو ہے تیری ہوا، اس میں بکھرنے سے رہا

بے خبر خود سے ہے اس درجہ وہ حُسن بے نیاز
لگ رہا ہے میرے ہاتھوں اب سنورنے سے رہا

روکتا ہے کون تجھ کو آزمائ کر دیکھ لے
تیرے کہنے سے کوئی لمبھرنے سے رہا

عشق میں اس بار شاہیں میں نے ڈالے ہیں گواہ
طلے ہوا ہے جو وہ اب اس سے مُکرنے سے رہا



میں کہ تنہا اعتبار ذات کھونے سے ہوا
جو ہوا وہ دل میں شک کا نج بونے سے ہوا

اک ذرا سے داغِ رسوائی کا اتنا پھیننا
ایسا دامن کو کسی جلدی میں دھونے سے ہوا

میں نے دیکھا ہے چمن سے رخصتِ گل کا سماں
سب سے پہلے رنگِ موسم ایک کونے سے ہوا

میں ہی بنتا ہوں فسادِ آب وِ گل کا ہر سبب
کس قدر نقصانِ میرا میرے ہونے سے ہوا

ایک ہنگامہ ہوا جو رات کے ایوان میں
روشنی کا خار ظلمت میں چھونے سے ہوا

کیا بتاؤں کس طرح جاتا رہا رخت سفر
یہ زیاد بس ایک پل رستے میں سونے سے ہوا

سر پہ ہی رہتا اگر پھر سر کا بچنا تھا محال
بوجھ میرا کم اسے ہر آن ڈھونے سے ہوا

زندگی گھستی رہی شاہیں بسر ہونے کے ساتھ
پیرہن کا رنگ پھیکا روز دھونے سے ہوا

O

شکوئے شکائیں ہیں زمانے کے ساتھ ساتھ
دریا رواں ہے خس کو بہانے کے ساتھ ساتھ

اک داغ ہے کہ جس کو مرا دست بے ہنر
پھیلائے جا رہا ہے منانے کے ساتھ ساتھ

اک آگ ہے چڑا کے جو لاتا ہوں دُور سے
اپنا کوئی کنارہ جلانے کے ساتھ ساتھ

لگتا ہے ہے جینے میں ہے کہیں اک جگہ فتور
چلتا ہوں تھوڑی خاک اڑانے کے ساتھ ساتھ

یہ شہر چھوڑنا ہے مگر چھوڑنا ہے یوں
رہنا بھی ہے یہیں کہیں جانے کے ساتھ ساتھ

سر پر جو بوجھ ہے وہ برابر ہے سر کا بوجھ
لیتا ہوں قرض، قرض چکانے کے ساتھ ساتھ

سر سے ہی کھینچ لے نہ کوئی تھوڑی چھت جو ہے
اک ڈر لگا ہے رزق کمانے کے ساتھ ساتھ

شاہیں خیال رکھ کسی تعمیرِ شوق کا
کچھ گر رہا ہے ہاتھ لگانے کے ساتھ ساتھ

O

یہ بے رحم رت تو گذر جائے گی
نشانی مگر کوئی دھر جائے گی

اگرچہ سرا سر ہے چھوٹی خبر
مگر کام اپنا یہ کر جائے گی

رنگے ہاتھ سب صاف ہو جائیں گے
سیاہی بھی منہ سے اتر جائے گی

بہت گھوم پھر کر اُداسی کوئی
مرے ساتھ ہی میرے گھر جائے گی

دے پاؤں آ، میرے کمرے کی چپ
ذرائع کرنے سے ڈر جائے گی

نہ منہ کھول کر اس قدر بات کر
کوئی گرد سانسوں میں بھر جائے گی

یونہی چلتے چلتے بدن کی یہ خاک
کسی راستے میں بکھر جائے گی

O

یہی تو دکھ ہے کہ یہ آگھی کہاں تک ہے
خوشی تو ہے یہاں لیکن خوشی کہاں تک ہے

تری ہی بستیاں ہیں یہ، ترے ہی لوگ ہیں یہ
مگر یہ دیکھ یہاں زندگی کہاں تک ہے

ملا تجھے تو بتائے گا صح کا تارا
ہماری دونوں کی آوارگی کہاں تک ہے

اے مست آنکھ! کبھی تھوڑی دری کو وا ہو
ذرا میں دیکھ لوں تو دیکھتی کہاں تک ہے

نکتا ہی نہیں جب ٹو اے ماہ وصل تو میں
بتاؤ کیسے تری روشنی کہاں تک ہے

کہیں اک آب خنک ہے جو ہے گریزاں سا
وہ پہلے پوچھتا ہے ^{تینگی} کہاں تک ہے

بتا رہا ہے ترا زور سا سفر شاہیں
اُداسی راہ میں بیٹھی ہوئی کہاں تک ہے



تم لاکھ کبو کچھ بھی نہیں، بات کوئی ہے
چہرے پہ کبیس رنگ ملاقات کوئی ہے

بھاتی ہی نہیں اس کو مرے نفع کی صورت
دشمن سی مری ذات ہی میں ذات کوئی ہے

خطرے میں مجھے کرتا ہے رکنے کا اشارہ
گرنے سے بچا لیتا ہے جو ہاتھ کوئی ہے

کچھ پوچھتا ہی رہتا ہے ہر وقت وہ مجھ سے
ہوتا نہیں، لگتا ہے مرے ساتھ کوئی ہے

ایسی بھی نہیں بات کہ ملنے سے گئے ہم
بس راہ میں بے مہری حالات کوئی ہے

O

نظر آتا ہے اب حد سے گزarna ہی پڑے گا
یہی صورت ہے جینے کی تو مرننا ہی پڑے گا

تعلق میں جو بے مہری ہے اس تک پہنچنے کو
کسی دن سرد پانی میں اترنا ہی پڑے گا

نہیں منظر کوئی گر دیکھنے کو، خاک تو ہے
کہ خالی آنکھ کو ہر طور بھرنا ہی پڑے گا

غرض کچھ ایسے دل میں گھر بناتی جا رہی ہے
کہ اب یاروں کو بھی ناراض کرنا ہی پڑے گا

جو کر بیٹھے ہو اس پہ آج یہ افسوس کیسا
غلط کاموں کا جرمانہ تو بھرنا ہی پڑے گا

مجھے معلوم ہے موقع کی ساری بات شاہیں
مگر وہ کہ رہا ہے تو مکرنا ہی پڑے گا

O

بسر اوقات کی ہر ایک صورت پاس رکھنی ہے
تلائشِ رزق میں رہنا ہے جمرت پاس رکھنی ہے

جو منظر دیکھنا ہے دیکھنا ہے وہ گھلی آنکھوں
کس سیرِ گلشنِ ہستی میں حیرت پاس رکھنی ہے

کے معلوم ہے دشمن یہاں کب کون بن جائے
ضرورت ہونہ ہو پھر بھی عداوت پاس رکھنی ہے

کہیں ایسا نہ ہو سادہ دلی میں سب لٹا بلیٹھوں
ضرورت کے مطابق ہی محبت پاس رکھنی ہے

نبیں ایسا نبیں ہے عاشقی میں سب گنوا ڈالوں
 گزارے کے لیے تھوڑی سی عزت پاس رکھنی ہے

برا بر کی مجھے رکھنی ہے اُس سے دوستی شاہیں
 مگر ترکِ تعلق کی سہولت پاس رکھنی ہے

O

جو حرفِ مہرباں سے دل ہمارا رکھ لیا ہے
مری جاں! قرض یہ ہم نے تمہارا رکھ لیا ہے

گرانی شہر میں وہ تھی کہ آخر گھوم پھر کر
جو کچھ بھی گھر سے پھینکا تھا دوبارہ رکھ لیا ہے

کسی کو دے ہی ڈالوں حوصلہ پڑتا نہیں ہے
بدن سے جیسا بھی کپڑا اتنا رکھ لیا ہے

جو اتنا شور و غل ہے اس کے ہی رو عمل میں
بجائے بولنے کے اک اشارہ رکھ لیا ہے

حسابِ دوستاں میں ہم نے اپنے تجربے سے
ہمیشہ کے لیے کوئی خسارہ رکھ لیا ہے

ہمارا مال کیا ہے، یہی تو دیکھنا ہے
مر بazaarِ خوابوں کا پتارہ رکھ لیا ہے

ہماری ہے غربی کی یونہی سی رات شاہیں
فلک سے جو بھی ٹوٹا ہے ستارہ رکھ لیا ہے



ضرورت ہے مری، اک اور چہرہ ساتھ رکھتا ہوں
میں دنیا دار ہوں اور کارِ دنیا ساتھ رکھتا ہوں

کبھی آب و ہوا تبدیلی کرنی پڑی جاتی ہے
بے مسکن حال میں ماضی و فردا ساتھ رکھتا ہوں

غرض حاصل نہیں، بے مصرفی اپنی چھپانے کو
برائے با غبانی کوئی صحراء ساتھ رکھتا ہوں

سپرد آب کر دیتا ہوں نا آسودہ خواہش کو
ہے دریا یہ زمانہ، رزقِ دریا ساتھ رکھتا ہوں

بگز نے جب بھی لگتا ہے ذرا چہرہ تمنا کا
مرمت کی لیے رنگ تمنا ساتھ رکھتا ہوں

مجھے تو بیچنا ہے بیچنے کو جو بھی مل جائے
میں نیکی کر کے قیمت کا تقاضا ساتھ رکھتا ہوں

ضرورت کیا کسی کی، خود میں چلتا پھرتا محشر ہوں
تماشا دیکھنے کو اک تماشا ساتھ رکھتا ہوں

مجھے ملتا ہے وہ شایس گرہ میں باندھ کر ڈوری
ادھر میں بھی بچھڑ جانے کا لمحہ ساتھ رکھتا ہوں

O

گھلا ہے پانیوں میں رنگِ یاس دریا کا
بہت دنوں سے ہے چہرہ اداس دریا کا

کنارے بیٹھنا اور بُنتے رہنا پانی کو
بنانا اس سے چمکتا لباس دریا کا

سمجھ کے سوچ کے ہمسائیگی میں جانا ہے
ابھی تو دیکھنا ہے آس پاس دریا کا

کہیں سیہ ہے کہیں سبز ہے کہیں نیلا
سمجھ میں آنہ سکا التباس دریا کا

میں اس کے ساتھ بھلا کیے گھومنے جاؤں
ہوا نہیں ہوں طبیعت شناس دریا کا

سفینے کو پڑا رہنے دو ریگ ساحل پر
مزاج ٹھیک نہیں بد حواس دریا کا

اسی میں ساری ہے نیرنگی جہاں شاہیں
سراب دیکھنا، کرنا قیاس دریا کا

O

ہوا میں کچھ نہ کچھ تعمیر کرتا رہتا ہوں
کوئی خلاء ہے جسے روز بھرتا رہتا ہوں

بڑے ہی شوق سے کرتا ہوں بزم کو آرا
پھر اس کے پاس ہی تہائی دھرتا رہتا ہوں

وہی مکاں ہے مگر اس میں وہ کمین نہیں
اُدھر سے عادتاً اب بھی گذرتا رہتا ہوں

بدلتی رُت میں نئے پیرہن کی خواہش میں
میں اپنے جسم سے خود ہی اترتا رہتا ہوں

بہت عزیز ہے جن کو یہ زندگی یہ جہاں
میں اُن کے واسطے اجرت پہ مرتا رہتا ہوں

چڑھا ہوا ہوں میں اپنے ہی چاک پر شاہیں
یہی کہ خود ہی گزرتا سنورتا رہتا ہوں



بلاتی رہی دیر تک رگذر
مگر تھک کے سویا ہوا تھا سفر

جباں سے سحر کا سفینہ چلا
ستارے کھڑے تھے اسی گھاٹ پر

ہوا کیا کہ منظر بدلتا نہیں
کہاں سو گیا کوئی دست ہنر

اٹھائیں جو آنکھیں وہ منظر نہ تھا
کہاں میں ہوا ایک پل بے خبر

کیوں کہاں کہ جو ہو رہا ہے یہاں
تھے بھی خبر ہے مجھے بھی خبر

نکنا تھا کب میں نے اس شہر سے
مجھے کہا گئی کثرتِ بام و در

کسی شے میں اب وہ کشش ہی نہیں
اترنے لگا جیسے رنگِ نظر

کوئی کام کر کے میں بیٹھا ہی تھا
مجھے آ گیا یاد کارِ دُگر

کسی خواب ہی کا وہ پس خواب تھا
گری آنکھ میں را کھسی رات بھر



میں جس شہر میں جس نگر میں رہا
فقط کثرتِ بام و در میں رہا

کثا اُس کی بات میں سب راستہ
سفر گم مرے ہم سفر میں رہا

میں کرتا رہا جمع ہر پیاس کو
کہیں ایک دریا نظر میں رہا

وہ اک اجنہی میرے اندر جو ہے
مرے ساتھ ہی میرے گھر میں رہا

پتا چل نہ جائے کہ میں کون ہوں
ہمیشہ اسی ایک ڈر میں رہا

میں اگ کار دنیا سے فرصت کے بعد
اُسی جیسے کار دگر میں رہا

اچانک ہوا جو مرے سامنے¹
کئی دن میں اُس کے اثر میں رہا



خلوتوں سے نکلا ہے یہ جہان تھوڑا سا
اب مجھے سمجھتا ہے راز دان تھوڑا سا

اک بڑی سیاہی کا معجزہ ہے دھل جانا
اب کسی جگہ پر ہے بس نشان تھوڑا سا

ہجرتوں کے موسم میں ہر مکاں ہے اک ڈر میں
اپنے ہی کمیں سے ہے بے امان تھوڑا سا

دیکھتے ہی دم بھر میں دھوپ بھر گئی میں
اک طرف سے نیڑھا ہے سائبان تھوڑا سا

جب بچا نہیں باقی ڈھانپنے کو سر اپنا
کھینچنا ہی پڑنا ہے آسمان تھوڑا سا

میں وسطِ دریا میں جھک گیا ہے اک جانب
تیر رو سفینے کا بادبان تھوڑا سا

اک گمان کی صورت کب سے تیرا کوئی
میرے اور اُس کے ہے درمیان تھوڑا سا

کچھ غلط ہے لبستی کی طرز ساخت میں شاپیں
بام و در سے باہر ہے ہر مکان تھوڑا سا



غور سے کسی شے کو دیکھنا بھی ہوتا ہے
آنکھ کو کبھی پورا کھولنا بھی ہوتا ہے

عرصہ محبت میں اک جگہ تعلق کو
اک بھرم سارکھنے کو کھینچنا بھی ہوتا ہے

رات کا وہی منظر ایک ڈر کے بستر پر
نیند کے کہیں اندر جا گنا بھی ہوتا ہے

یہ نہیں کہ کافی ہے بس ہوا کپڑ لینا
پھر قبا بنانے کو کاتنا بھی ہوتا ہے

یہ تمہارا پچھتاوا اب بتا رہا ہو گا
بات کرنے سے پہلے سوچنا بھی ہوتا ہے

عیشِ وصل کے دودن اور ان کے اندر ہی
بدگماں بھی ہونا ہے چھوڑنا بھی ہوتا ہے

کون ہو، کہاں کے ہو اور کیسے ائے ہو؟
ہے اگر زبان منہ میں بولنا بھی ہوتا ہے

کس مزے سے بیٹھے ہو پاؤں توڑ کر شاہیں
خود کو گم کہیں کر کے ڈھونڈنا بھی ہوتا ہے

O

یقین اب کس تازہ گماں پر رکھنا ہے
اک اور آسمان اس آسمان پر رکھنا ہے

میں سوچتا ہوں مہِ صل کے طلوع کے بعد
ستارہ شب بھراں کہاں پر رکھنا ہے

جو دھوپِ صحن میں تھی سردیاں گذرنے پر
اب اس کو گھر کے کسی سامباں پر رکھنا ہے

بڑھا رہا ہے جو ہر آن خود بتائے گا
یہ بوجھ سارے کا سارا کہاں پر رکھنا ہے

کوئی چراغ اگر ہے بھی شہر تیرہ میں
تو اس چراغ کو کس کس مکاں پر رکھنا ہے

بنا رہی ہے یہاں پانیوں کی پایابی
اُبھی سفینے کو ریگ روائی پر رکھنا ہے

نہ کام آئی شرافت مری یہاں شاہیں
اب ایک حرفِ برہنہ زبان پر رکھنا ہے

O

اشجار، سائے، راگہندر سب ہیں خواب میں
اور ان کے ساتھ ابل سفر سب ہیں خواب میں

یہ بحر، یہ ہوا، یہ پہاڑوں کے سلسلے
بیدار لگ رہے ہیں مگر سب ہیں خواب میں

کن رت جگوں کا قرض ہے، اتر گا جانے کب
یہ لوگ اور ان کے نگر سب ہیں خواب میں

گلیوں میں دور تک نہیں کوئی بجز ہوا
آوازِ پا کہ دسب در سب ہیں خواب میں

کیسے بناؤں نقشِ محبت جو دل میں ہے
کاغذ، قلم کہ دستِ ہنر سب ہیں خواب میں

شامل کہاں سے رزق میں ہوتا ہے کیا کہوں
وہ زہر جس کے زیرِ اثر سب ہیں خواب میں

O

کوئی وہم یا گماں شام کا
کہ چلنے لگ آسماں شام کا

ذرا دیر پہلے جہاں دھوپ تھی
وہیں تن گیا سائباں شام کا

ابھی چل پڑے گا سفینہ شب
ہوا میں ٹھلا بادباں شام کا

ادھورا ہے دن اور پھر اس میں بھی
کوئی وقت ہے رایگاں شام کا

وہیں رات بننے میں مصروف ہے
لرزتا ہے تارا جہاں شام کا

اندھیرے اجائے میں لپٹا ہوا
ذرا سرخ ہے درمیاں شام کا

دھرمی دن کی لا حاصلی جس جگہ
پڑا تھا وہیں پر زیاد شام کا

نہ جانے کہا ڈوبتے دن نے کیا
بہت چپ ہے آبِ رواں شام کا

پرندوں کے آنے کا ہے منتظر
صداؤں سے خالی مکاں شام کا



دیوار چھوڑتی ہے تو در چھوڑتا نہیں
واپس سفر سے آیا ہوں مگر چھوڑتا نہیں

جو سن رہا ہوں بات، بے تاثیر سے تھی
جو کہ رہا ہوں وہ بھی اثر چھوڑتا نہیں

جو انٹھ گیا ہے اصل میں بے اعتبار ذات
میں ہوں مگر نہ ہونے کا در چھوڑتا نہیں

ہر چند بودو باش کے قابل نہیں یہ اب
جانے لگوں کہیں تو مگر چھوڑتا نہیں

بس دیکھنا ہے آنکھ جہاں تک ہے معتبر
اس سے پرے فرہب نظر چھوڑتا نہیں

اب بیج گیا ہے پاس مرے صرف ایک خواب
اور خواب بھی کچھ ایسا ہے مر چھوڑتا نہیں

لا حاصلی کچھ اس دفعہ شاہیں زیادہ ہے
نتم سفر پر رنج سفر چھوڑتا نہیں



ہوئی پھر یہ تر فضا شام کی
کہ گہری بہت ہے گھٹا شام کی

کھڑا جس جگہ تھا سفینہ، شب
چلی اس طرف کو ہوا شام کی

کوئی رنگ بننے نہیں دے رہی
بدلتی ہے ہر پل ضیا شام کی

اندھیرے کی چادر کے ٹھللے کے ساتھ
سمٹتی گئی خود ردا شام کی

یہ ممکن ہے کچھ کہ رہی ہو جتھے
ذرائع نور سے سن صدا شام کی

اگر پج گیا دن کے عفریت سے
تو کھا لے گی مجھ کو بلا شام کی

کبھی رات ہو کوئی نیندوں بھرمی
یہی رہ گئی ہے دعا شام کی

O

سب سے پہلے تو سوچنا ہے اُسے
پھر جہاں بھی ہے ڈھونڈنا ہے اُسے

جمع کرنا ہے اگر ہے بکھرا ہوا
ہے شکستہ تو جوڑنا ہے اُسے

وہ حقیقت ہے یا سراب کوئی
دونوں طرفوں سے دیکھنا ہے اُسے

وہ ضرورت ہے جس قدر جس کی
اسی نسبت سے باٹھنا ہے اُسے

سوچتا ہوں کہ اب کے رستے میں
ساتھ رکھنا کہ چھوڑنا ہے اُسے

پوچھنی اس سے بات ہے کوئی
ایک مشکل میں ڈالنا ہے اُسے

بدگمانی ہے وہ کہ اب شاہیں
اپنے بارے میں بولنا ہے اُسے

O

دامہی کسی شک کے گرفتاروں میں رہنا
ہوتے ہوئے بھی ہونے سے انکاروں میں رہنا

بس نیند میں پھرنا کسی خوابیدہ مکاں میں
اپنی ہی بنائی ہوئی دیواروں میں رہنا

رکھ دینا کبھی بیچنے خود کو سر بازار
اور آپ ہی پھر اپنے خریداروں میں رہنا

رکھنا بھی اگر سر پہ تو کچ رکھنا لکھ کو
پیچاک سا بن کر کہیں دستاروں میں رہنا

محتاجِ ستائش کبھی ہونا نہ کسی کا
خود آپ بہت اپنے پرستاروں میں رہنا

خوشیاں بھی اگر ہیں تو وہ ہیں اپنی طرح کی
کچھ اپنے ہی اقسام کے آزاروں میں رہنا

ہو اُس کی بُرائی تو بڑے شوق سے سننا
ویسے تو سدا اس کے نمک خواروں میں رہنا

چل پڑنا زرِ خواہشِ دل جیب میں بھر کر
سودا ہو کوئی پہلے خریداروں میں رہنا

ہو جرم کہیں بھی اُسے لکھ دینا مرے نام
یہ کیا کہ سدا میرا خطا کاروں میں رہنا

شاہیں یہ بخیلی ہے فقیری نہیں تیری
اک دولتِ دل رکھ کے بھی ناداروں میں رہنا

O

کوئی عکس میرے گمان کا یہیں ہے کہیں
مرے جیسا ہی ایک دوسرا یہیں ہے کہیں

کوئی اختلاف ہے بڑھ رہا ہے جو ہر گھنٹی^۱
مرا اپنے آپ سے سامنا یہیں ہے کہیں

یہ جو گنجائک ہے اسے ذرا سا پرے بٹا
بڑی سیدھ میں ایک راستہ یہیں ہے کہیں

اسی نے مجھے ہے مری حدود میں رکھا ہوا
مرے دیکھنے کو جو آئینہ یہیں ہے کہیں

مجھے پرزاہ پرزاہ اڑا رہی ہے یہ دیر سے
مرے آر پار جو ہے ہوا یہیں ہے کہیں

کوئی چیز دل کو کریدتی ہے نرمی طرح
مجھے کھا رہی ہے جو اک بلا یہیں ہے کہیں

مرے قاتلوں کے خلاف سب ہیں شہادتیں
مرے خونِ ناحق کا فیصلہ یہیں ہے کہیں

ذرا احتیاط سے پاؤں رکھنا زمین پر
کوئی نام شاہیں گرا ہوا یہیں ہے کہیں

O

وہ حرکت سے عاری کڑی رات تھی
کوئی میخ بن کر گڑی رات تھی

اندھیرے میں مشکل تھا یہ دیکھنا
کہ لیٹی ہوئی یا کھڑی رات تھی

بنائے تھے جس نے بھی یہ ماہ و سال
اُسی نے پھر ان میں جڑی رات تھی

اگا دن تھا پہلے کہ پہلے یہاں
عدم کے شجر سے جھڑی رات تھی
تھکا چاند لینا تھا دن کو جہاں
وہیں دھوپ اوڑھے پڑی رات تھی

گذرتے ہوئے عرصہ بھر سے
کہیں اک جگہ پر اڑی رات تھی

گزاری جو تہائی میں مے کے ساتھ
وہ سرما کی سب سے بڑی رات تھی

وہ شاید جوانی ہی تھی جب میاں
پناہ تھا دن چلچڑی رات تھی

ق

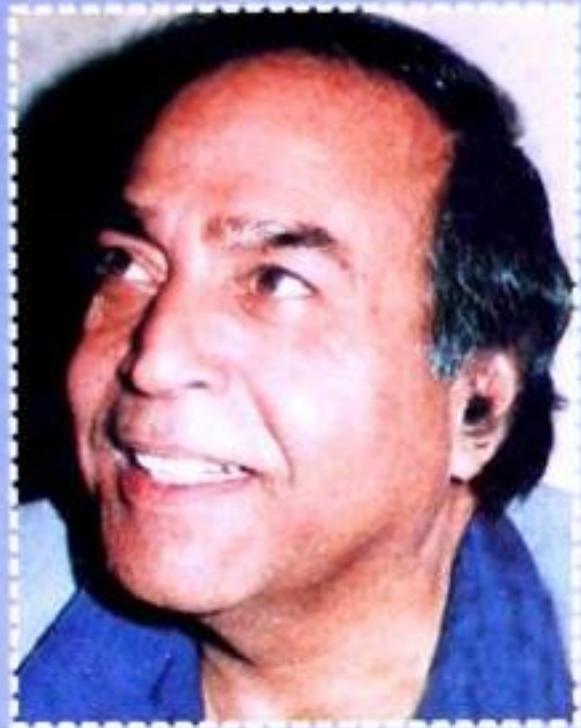
یہ اکثر ہوا میرے بستر کے پاس
سراسر برہنہ کھڑی رات تھی

مجھے دیکھ کر سرد، بے مہر سا
مرے ساتھ بے حد لڑی رات تھی

تھا زنجیر سا میرے پاؤں میں دن
مرے ہاتھ میں ہتھڑی رات تھی

مرے گھر کی دہنیز پر صح دم
کسی لاش صورت پڑی رات تھی
بندھے جس میں تھے سب مظاہر یہاں
اُسی سالے کی کڑی رات تھی

ترکیبِ حصل جہاں اس کے نتائج
میں ملکہِ گر بیسے ہے یہ اس اپنی حر
فیکار سے مطلع ہے اور ترکیب
کو جو عین اپنے دنیا اس کے بعد اس کا
بہانہ پڑتا ہے۔ اس کے عین مخصوص
لئے بھی تھا اس کے نتائج ہیں۔ اس کی شعری
لایکن اسی ہے۔ اس کے ہر خال، ہر وادی،
ہر صورتِ حال کے لئے اچھائیِ عجیبی ربان
ہستہ کی ہے۔ اس کا اسلوب یہ سادھی
ہے۔ جو لوگ اخباری ربان میں شاعری کرنے ہے
یہ اُنہیں جاوید شاہیں سے ربان کا عجیبی استعمال
سکھنا چاہئے۔ اس کی قلم اور ربان میں دونوں
سطوں پر بحالت کا اگرا شعور موجود ہے۔ قلم
صحیح کے ایک ممتاز قادر لان جاگنس نے یہے
اُب کی تحریف کرتے ہوئے کہا تھا کہ یہاں اُب
ہوئے اسلوب اور بڑی اگر کے اشتراک سے یہاں
ہوتا ہے۔ جاوید شاہیں کی شاعری اس معیار پر ہر
اعظیار سے پوری اترتی ہے۔



جاوید شاہیں کی شاعری متعدد حوالوں کی بنابرے حد منفرد اور قابل توجہ ہے۔ اس کے نئے شعری طرز احساس اور اسلوب نے ہم عصر اردو شاعری کی تخلیقی جہتوں میں ایک نئی جہت کا اضافہ کیا ہے۔ اس کی شاعری کے مطلع سے وہ تحکمن پیدا نہیں ہوتی جسے ہم عموماً انسانی صورت حال کے معنی ادراک سے منسوب کرتے ہیں۔ اس کے برعکس اس کی شاعری ہمارے اندر آزادی اور رہائی کا احساس پیدا کرتی ہے۔

جاوید شاہیں بنیادی طور پر سماجی اور سیاسی شعور رکھنے والا شاعر ہے۔ اس کی شاعری میں ایک ایسی کڑواہت موجود ہے جو ایک روشن مستقبل سے نامیدی کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے۔ یہ ایک تخلیقی نسل کا الیہ ہے کہ جس خوبصورت دنیا کا خواب اس نے دیکھا تھا وہ اُسے دھوکہ دے گئی۔

جیلانی کامران

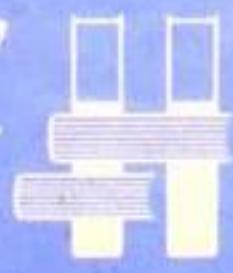
جاوید شاہیں کی شاعری سے مجھے سچ کی خوبصوراتی ہے۔ اس نے وہی کچھ کہا ہے جو اس پر بتا ہے اور جسے اس نے سچا پایا ہے۔ یہ سچ میٹھا تو کہیں بھی نہیں ہے۔ بس کھٹا میٹھا ہے یا پھر کڑوا۔

وہ اپنی ذات کے حوالے سے اپنے معاشرے اور عہد کی بات کرتا ہے اور وہ بھی اپنی ہی تراشی ہوئی اصطلاحوں اور لب و لبھ میں۔ بہت کم ایسے شاعر ہیں جنہیں اپنے عہد کا اتنا گہرا شعور ہو۔ جھوٹ پر پلنے والے آج کے عہد میں سچ کے سامنے آنکھیں کھول کر کھڑے ہو جانا اور اُسے اپنے اندر اتا رنا اور پھر زبان سے ادا کرنا کوئی معمولی یا آسان کام نہیں ہے۔ سچ کو شاعری بنانا خواہ وہ سیاہ ہو یا سفید، سرخ ہو یا زرد، سچ بولنے سے بھی مشکل کام ہے۔ جاوید شاہیں نے یہی مشکل تر کام کرنے کی جرات کی ہے۔ اس کی گھلی آنکھوں میں بصارت اور بصیرت دونوں موجود ہیں۔

محمد حنفی رامے

فِکْشَنْ هَاؤس

18-مزگ روڈ لاہور



E-mail: fictionhouse2004@hotmail.com

Ph: 042-7249218, 7237430